© rasailojaraid.com

میں روز افزوں ترقی، سب اسی سائنس اور فنیات کے کرشمے ہیں، جس نے پرانے ''معبودوں'' کو معزول کر دیا ہے، اور نئے دیوی دیوتاؤں کا روپ دھار لیا ہے۔ دنیا کی سبھی قومیں انھیں اپنے صحن میں اتارنے اور اپنے سنگھاسن پر بٹھانے کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت اور مقابلہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ سائنس اور فنیات وہ طلسمی چھڑی یا الٰہ دین کا روایتی چراغ ہیں، جن سے غربت، بھوک، بے روزگاری، جہالت اور بیماری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خوش حالی، قوت، خیر و برکت اور مسرتوں کا سنہرا دور شروع ہو گا اور دنیا ہی میں جنت کی ایک نئی بساط بچھا دی جائے گی۔

سائنس اور فنیات کا یہ تصور عوام ہی کا نہیں، بلکہ خواص بھی اس میں شریک ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ سائنس کی تعریف، خود مغرب میں، جہاں جدید سائنس نے جنم لیا، کیا کی جاتی ہے۔

اس مضمون میں سائنس سے مراد وہ فطری علوم ہیں، جو جدید یورپی تہذیب نے لگ بھگ ۴۰۰ سال کے عرصے میں تخلیق کیے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آج کی دنیا کی صورت گری اور اس کی موجودہ حالت (مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے) بڑی حد تک اسی سائنس کی مرہون منت ہے۔ اگر نسل انسانی کو اگلی صدی یا مزید چند سو سال پورے کرنے ہیں، تو آج ہمیں اس سائنس کی بنیادوں کا گہرا شعور حاصل کرنا ہو گا، اور اسے صحیح طریقے سے کنٹرول کرنا ہو گا، کہ جن بڑی حد تک بوتل سے باہر آ چکا ہے، اور بہت سے دانش وروں کے خیال میں اب اس کی واپسی ایک محال خوش خیالی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ابتدائی تہذیبوں میں مذہب، فلسفہ اور سائنس باہم کچھ اس طرح مربوط تھے کہ ان کے علاحدہ علاحدہ تشخص کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب سے کوئی ۶۵۰۰ سال قبل مصر، وسطی امریکہ اور دنیا کے بعض دوسرے علاقوں میں جن تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں، وہاں مقبروں، مجسموں، اور تحریروں سے ان کی فکر، مذہب اور فنی مہارتوں میں ان کے کیف و کم کا پتہ چلتا ہے۔ ۵ ہزار سال قبل کے اہرام مصر اور وسطی امریکہ میں ''انکا'' کی تہذیبوں کے آثار، ان کی عمارت سازی، سنگ تراشی، جر ثقیل، ہیئت اور فلکیات میں ان کی ہنرمندی، اور عالم طبعی کے گہرے مشاہدے کی خبر دیتے ہیں۔

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ بہت سی مہارتیں اور ہنر اور بہت سے علوم، جو مصر، وسطی امریکہ، قدیم چین، بابل اور جنوبی ہند کے مندروں، غاروں، تعمیرات اور ان کی چھوڑی ہوئی تحریروں میں جھلکتے ہیں، وہ ایک مرحلے پر جا کر رک سے گئے تھے۔ خود ایشیائے کوچک، یونان اور قدیم روم کے علوم بھی ابتداً جدید مغربی دنیا تک بالواسطہ ہی پہنچے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی، جس کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ مغربی تہذیب، فکر اور فلسفہ میں پیوست ہیں، کرۂ ارض پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۰لاکھ سالہ انسانی وجود کے مقابلے میں تین سو سال سے زیادہ پرانے نہیں۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر مُحیطِ کُل دست رس اور زبردست غلبہ، ابھی کل ہی کی بات ہے۔

فطری علوم، ہنر اور مہارتیں، ان کی دریافت، ایک قوم سے دوسری قوم تک ان کی منتقلی کے اثرات، فرد اور معاشرے کی زندگی کے کسی ایک شعبے ہی تک محدود نہیں رہتے، بلکہ ان کے اثرات ہمہ گیر ہوتے ہیں، اور وہ فرد اور معاشرے کے نظامِ عقائد و عمل کو بدل کر رکھ دیتے ہیں، بلکہ اس سارے ماحول میں تغیر برپا کر دیتے ہیں، جن میں انسان رہنے پر مجبور ہے۔

فنیات یا ٹیکنالوجی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ چیزوں کی ساخت اور عملی کاموں کے کرنے کے منضبط مطالعے کا نام ہے۔ جب کہ انگریزی کی اصطلاح technology دو یونانی الفاظ سے مرکب ہے۔ techne، جس کے معنی فن (art)، اور ہنر (craft) کے ہیں، اور logos جو "لفظ"، "زبان" اور "فکر" کے معنی رکھتا ہے۔ گویا ٹیکنالوجی فن و ہنر کے بارے میں گفتگو اور تفکر کا یا اس کے مطالعے کا نام ہے۔ جب کہ سائنس دراصل کائنات و مافیہا اور فطرت کے فہم اور اس کی تعبیر کی منظم کوشش کو کہتے ہیں۔ فنیات یا ٹیکنالوجی، چیزوں کو بنانے اور انھیں استعمال کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ جب کہ سائنس کی دلچسپیاں بڑی حد تک نظری ہیں کہ اس کا مطمح نظر حصول علم ہے۔ سائنس سے اس مضمون میں ہم "فطری علوم" ہی مراد لیں گے۔ اگرچہ یہ لفظ سماجی علوم کے لیے بھی عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بنجامن فرینکلن نے کہا تھا کہ "انسان، آلہ ساز حیوان ہے"۔ بات اپنے اپنے ادراک کی ہے۔ انسان کو مختلف سوچ اور مختلف دلچسپیاں رکھنے والوں نے مختلف طرح سے دیکھا ہے اور اپنے زاویۂ نگاہ سے اس کی تعریف کر دی ہے۔ اگرچہ انسان، آلہ ساز کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے، مثلاً کچھ لوگوں کی مطابق وہ ایک مذہبی حیوان ہے، یا حسن کار اور حسن داں حیوان ہے۔ مگر یہ بات اہم ہے کہ آلات سازی کی صلاحیت، اور ان کے استعمال کے ذریعے انسان اپنے فطری ماحول اور اپنی ذات اور معاشرے میں جو تبدیلیاں کر پایا ہے، وہ ان کے بغیر ممکن نہ تھیں۔ بعض حیوانات بھی کبھی کبھی پتھر اور لکڑی کا استعمال کر لیتے ہیں۔ مگر اپنے مقصد کے حصول کے لیے آلات سازی، انسان ہی کی امتیازی صفت ہے۔ علمائے اثریات کے مطابق اب سے کوئی ۷۰ ہزار سال قبل انسانوں نے پتھر کے اوزار بنا لیے تھے۔ مٹی سے ظروف سازی کوئی ۲۰ ہزار سال قبل شروع ہوئی اور فلزات کا عہد ۱۰ ہزار سال سے زیادہ پرانا نہیں۔

لیکن فنیات کی یہ ابتدا، انسان کی عملی ضروریات کے لیے اس کی پیش رفت کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ اب سے ڈھائی ہزار سال قبل ہمیں عمارت سازی، مجسمہ سازی، ظروف سازی، رنگ سازی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس طرح کی جو فنیات نظر آتی ہیں، ان میں نظری سائنس کا دخل کم ہی تھا، ٹیکنالوجی بڑی حد تک عملی مہارت ہی کی مرہون منت تھی۔ آج ہم جسے ٹیکنالوجی کہتے ہیں، اس کی ابتدا انیسویں صدی ہی میں ہو سکی ہے۔ جب سائنس دانوں کی دریافتوں کو عملی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس کی سب سے زیادہ واضح مثال ایڈیسن کی ہاں ملتی ہے۔ اس نے برق سے متعلق فیراڈے کے تجربات کو بنیاد بنا کر برقی روشنی کا سب سے پہلا نظام قائم کیا۔ اسی طرح گراہم بیل نے پہلے ٹیلی فونی نظام کی بنیاد رکھی، اور مارکونی نے ہرٹز اور میکس ویل کے تجربات اور علمی دریافتوں کی بنیاد پر بے تار برقی رو کی ٹیکنالوجی کی ابتدا کی۔ تاہم بعض علمائے انسانیات کو، اس اعتراف کے باوجود کہ ٹیکنالوجی کی اصطلاح سترہویں صدی سے پہلے نظر نہیں آتی، اس امر پر اصرار ہے کہ فنیات کی عمر بھی وہی ہے، جو انسان کی ہے اور مذہب اور فلسفے کی طرح یہ بھی اس کی فطری ساخت کا ایک غیر منفک جزو ہے۔

اس مضمون میں میرا ارادہ سائنس اور اس کی برکات، حرفت و فنیات کے کمالات کی حمد و ثنا یا ان سب کی تنقیص و استرداد نہیں ہے۔ ان دونوں جہات سے بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ خصوصاً سائنس کے معجزات، انسانی زندگی کے بوجھ کو کم کرنے، اس میں آسانیوں اور فراوانیوں کے فراہم کرنے اور اسے لذتوں اور خوشیوں سے ہم کنار کرنے میں اس کے کردار پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اب تیسری دنیا کے ''ترقی پذیر'' ملک اس مستقبل کی طرف پرامید نظروں سے دیکھ رہے ہیں، جو اس شجر علم کے شیریں ثمرات کی صورت میں انھیں مل سکتا ہے۔

سائنس نے انسانی زندگی کو جن مشقتوں کے بوجھ سے آزاد کیا ہے، اور جو سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی ہیں، عموماً یہی اس میں مزید انہماک، مزید وسائل اور تحقیق و تفتیش کے لیے جواز پیدا کرنے کے لیے کافی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن مغربی مفکرین کے ایک خاصے بڑے گروہ نے سائنسی فکر کے لیے ایک اور قابل غور جواز مہیا کیا ہے: سائنسی فکر، طریق کار اور رویے سے فطرت انسانی اور سماجی مسائل پر غور و فکر کے لیے زیادہ مثبت، معروضی اور باثمر راہیں کھلتی ہیں، جن سے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حکمت عملی اور اہداف کا بہتر تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔

یورپ میں سائنس کے خلاف تحریکیں بھی نئی نہیں۔ ولیم بلیک، جوہان وولف گینگ فان گوئٹے سے لے کر نٹیل پوسٹ مین، برے آن ایبل یارڈ اور ''یونا بامبر'' تک ہمیں ناقدینِ جدید سائنس کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ لیکن فرنکس ٹائن کا کردار تخلیق کرنے والے سائنس دشمنوں اور آج کے ناقدینِ سائنس میں کئی جہتوں سے فرق ہے۔ آج کے ناقدین میں سے بہت سے، بیسویں صدی میں فوجی فنیات اور سائنس میں غاصب، ظالم اور اخلاق و اقدار سے عاری حکمرانوں یا حکومتوں کی دلچسپی اور ان کی مالی امداد (بلکہ وسائل کو بے محابا جھونکنے) کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور دعویٰ کرتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ سائنس اور اہل سائنس جو کچھ کر رہے ہیں، وہ حصول حکمت و دانائی کی وہ معصومانہ عبادتیں نہیں، جن کے پیچھے ایک عام انسان کی فلاح اور اس کی مصیبتوں کو رفع کرنے کا انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہو۔ سائنس دان کا یہ دعویٰ کھوکھلا اور منافقانہ معلوم ہوتا ہے کہ سائنس تو اخلاقی طور پر بے رنگ اور غیر جانب دار ہے، پس اس کے غیر ذمہ دارانہ اور انسان دشمن استعمال کے لیے ہم جواب دہ نہیں ہیں۔ ناقدین دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنسی اور فنیاتی پیشوں سے متعلق بڑے بڑے اداروں اور صنعتی، اقتصادی اور سیاسی قوتوں کے درمیان گٹھ جوڑ کچھ نیا نہیں ہے۔ سائنس دانوں میں اخلاقی رمق موجود ہے تو انھیں اس کا احساس کرنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، ان کی تحقیق اور دریافتوں اور ایجادات کے کیا نتائج و عواقب سامنے آرہے ہیں، اور ممکنہ طور پر مستقبل میں کیا پوشیدہ ہے۔

کیا یہ بات دلچسپ نہیں کہ آج کے شعور کے مطابق ایک سائنس دان، موجد اور فنیاتی، اپنے علم اور تکنیک کے مضمرات کے لیے کسی بھی شخص یا ادارے کے آگے جواب دہ نہیں؟

اگر ارتقائے انواع کا ڈارونی نظریہ انسان کو محض ایک Naked Ape کے زمرے میں ڈال دیتا ہے، اگر کرداری نفسیات اسے چوہے اور کتے کی سطح پر لاکر محض ایک "مہیج ردعمل" والا عضویہ ثابت کر دیتی ہے، اگر جینیاتی دریافتوں سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ہم جنسی کوئی قابل نفریں اخلاقی جرم نہیں، بلکہ محض ایک مختلف جینیاتی بندوبست سے پیدا ہونے والی جسمی، ذہنی کیفیت ہے۔ اگر جینیاتی انجینیرنگ کے ذریعے مطلوبہ جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی خصوصیات رکھنے والے انسان پیدا کرنے کی تکنیک پروان چڑھائی جا سکتی ہے، اگر جرثومۂ حیات کے منجمد ذخیروں سے استفادہ کر کے مویشیوں کی طرح انسانوں کی بہتر نسلیں پیدا کی جا سکتی ہیں، تو یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ سائنس، اپنے سے بڑھ کر کسی اعلیٰ تر قدر کی قائل نہیں۔ "علم قوت ہے" (فرانسس بیکن)، اور قوت خیر ہے، اور خیر کی کثیر تر مقدار کا حصول، لازماً مطلوب ہونا چاہیے۔

اسلامی فلسفہ حیات و کائنات اس بے لگام اور مطلق نظریہ علم کو قبول نہیں کرتا۔ دوسرے ماہرین کی طرح سائنس دان اور ٹیکنوکریٹ بھی معروف اور منکر کی ان حدود کے پابند ہیں، جو قرآن مجید اور حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کر دی ہیں۔ میرے خیال میں وہ ساری سائنس اور فنیات ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہونی چاہییں جن کے مہیا کردہ علوم اور مہارتیں امکانی طور پر انسان کے خلاف استعمال ہو سکتی ہوں، یا اسے اس شرف و کرامت سے محروم کرتی ہوں، جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے۔ اس طرح انسانی جنین پر ہر طرح کے تجربے، انھیں مستقبل کی پیوند کاریوں کے لیے موادِ وسائل (resoruce material) کے طور پر استعمال کرنا، پروزیک، میسکی لین اور LSD جیسی ادویات کی ترقی، جو انسان کے شعور کو تبدیل کر دیتی ہیں، ہرگز قبول نہیں کی جا سکتیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کے نظریۂ علم کے مطابق حقیقی علم کا ہدف منشائے الٰہی کو سمجھنا ہے، اور انسان کی سعی و جہد کی درست سمت، اپنے اس علم کی روشنی میں اور اس کی مدد سے اپنے مالک کی مرضی کو اس دنیا میں پورا کرنا ہے۔ اسی کے نتیجے میں حقیقی فلاح، یعنی آخرت کی دائمی کامیابی ممکن ہے۔ ان اہداف کے شعوری احساس کے بغیر علم و حکمت کے حصول کی ساری کوششیں ازیاد جہالت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں گی۔ تسخیر کائنات اور عناصر پر قابو کی وہ ساری کامیابیاں، جو ان اہداف کے لیے نہیں، محض باطل اور مردود ہیں کہ یہ انسان کو اس کی حقیقی منزل سے دور لے جانے والی ہیں۔

آفاق و انفس کا وہ سارا علم، جو اللہ کے حوالے کے بغیر ہے، اور جو اس کی منشا کے تصور سے عاری ہے، اسلامی علم یا سائنس نہیں، اور ہمارے نقطہ نظر سے وہ محض بے وقعت ہی نہیں، بلکہ مضر ہے۔ کیوں کہ یہ وسیع تر سیاق میں علم ہی نہیں، بلکہ نری جہالت ہے۔ اس کے نتیجے میں دنیاوی لذات کا حصول (اگر ہو) ایک نفع عاجل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، جس کی قیمت اسی دنیا میں اربوں انسان ادا کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے زاویے سے دیکھیں، تو اس کا نتیجہ آخرت کے دائمی خسارے کے علاوہ اور کچھ نہیں:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ (سورہ ابراہیم ۱۴: ۲۸، ۲۹)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتار دیا؟ یہ وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے، جس میں وہ آن پڑیں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

ان آیات کے متعدد مفاہیم اور مصداق میں یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم، صلاحیتوں اور وسائل کی جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان کی ناشکری یعنی غلط استعمال سے سوائے تباہی اور دائمی عذاب کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، اور اس کے قائدین ہی اللہ کے نزدیک اصل مجرم ہیں۔ یہ بات توجہ اور غور کی متقاضی ہے کہ بیسویں صدی، جو سائنس و صناعی میں انسانی پیش رفت کی بے مثال صدی ہے، ابتدا سے انتہا تک جنگوں اور بڑے پیمانے پر ہلاکت کی صدی بھی ہے۔[۲] تاریخ میں کبھی انسان کے ہاتھوں انسان کی بربادی کے یہ نظارے چشم فلک نے نہیں دیکھے۔ پھر ٹیکنالوجی نے یہ نظارے ٹی وی اور ابلاغِ عامہ کے نت نئے وسائل کے ذریعے عام گھروں میں پہنچا دیے۔ لوگ خلیج کی جنگ، اوکلاہوما کی بم باری، افغانستان، کشمیر، بوسنیا اور چیچنیا میں انسان کے ہاتھوں انسان پر درندگی کے منظر اس طرح دیکھتے ہیں، جیسے یہ کوئی فرضی ڈرامائی تشکیل ہو۔

سائنس اور دوسرے سماجی علوم میں وہی پالیسی اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہوگی، جو فرد اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوری انسانیت کے اصل ہدف 'یعنی فلاح اخروی کے حصول میں ممد و معاون ہو۔

اب ذرا "ترقی" کے لفظ کی طرف آیئے۔

ترقی (development) کی اصطلاح اپنے جدید مفہوم کے اعتبار سے ۱۸ویں '۱۹ویں صدی سے پہلے مغربی زبانوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ اس کا رواج مغرب میں سائنس اور فنیات کے عہد سے ہوتا ہے' جب تحقیق و ترقی (research & development) کے نتیجے میں اول الذکر نے کائنات کی مابعد الطبیعی مذہبی بنیادوں کو ڈھا دیا' اور ثانی الذکر نے انسان کو مشین کے ذریعے تیز رفتاری' سہولتِ کار اور نئے ذرائع پیداوار سے آشنا کیا۔ آج یہ اصطلاح نہ صرف مغرب بلکہ ساری دنیا کا روزمرہ بن گئی ہے۔ ۳ے اس لفظ نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے: "ترقی یافتہ اقوام" اور "غیر ترقی یافتہ اقوام" (ترقی پذیر اقوام کی دل خوش کن اصطلاح 'ان قوموں کے نصیب میں آئی' جو بزعم خود مغرب کو ماڈل بنا کر اس جیسا بننے کی کوشش میں مصروف ہیں)۔ "ترقی" کا لفظ ایک خالصتاً مغربی تصور تاریخ کی عکاسی کرتا ہے اور مختلف انواع کی تہذیبوں اور ثقافتوں کے فروغ کی بجائے ایک مخصوص تہذیب و ثقافت کے ظہور میں آنے اور بارور ہونے ہی کو مستحسن گردانتا ہے۔ "لغات توفی" کے مدیر کے مطابق اس لفظ کے استعمال نے "تاریخ کو ایک پروگرام" میں تحویل کر دیا ہے: یعنی ایک لابدی اور تقدیر میں۔ ۴ے چوں کہ مادی فلسفہ علم وفن کے جلو میں پلنے بڑھنے والی سائنس اور فنیات اور صنعتی ترقی کو انسانی خیر و فلاح کے واحد ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے' اس لیے اس کے نتیجے میں تعمیر و ترقی کے مخصوص تصور سے تاریخ کے ایک خالصتاً مغربی نقطہ نظر کا ساری دنیا پر غلبہ ہو گیا ہے۔ اس طرح مختلف اقوام اپنی سماجی زندگی کے مخصوص اسلوب کو فروغ دینے کے مواقع سے محروم یا دست بردار ہوتی جا رہی ہیں۔ ۵ے

اب سوال یہ ہے کہ تعمیر و ترقی (ارتقا!) کا مغربی مفہوم ہے کیا؟

انیسویں صدی کے وسط میں چارلس ڈارون نے حیوانی ارتقا کا جو نظریہ پیش کیا' اور ہربرٹ اسپنسر نے جس طرح اس کا اطلاق دوسرے شعبوں میں کیا' اس کے بنیادی اصول اور خدوخال قوموں کی ترقی' علوم کی ترقی' فنیات کی ترقی' سماج اور سماجی اداروں کی ترقی کے لیے بھی ویسے ہی درست اور قابلِ اطلاق بتائے گئے۔ ترقی کا مطلب ہے سادہ سے پیچیدہ' ادنیٰ سے اعلیٰ' ناموافق سے موافق کی طرف پیش رفت۔ مگر دنیا کے دو تہائی سے زیادہ انسانوں کے لیے (جو "غیر ترقی یافتہ" ہیں) یہ لفظ ایک ناپسندیدہ اور بے توقیر سماجی رتبے کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس سے نکل بھاگنے کے لیے ان پر لازم آتا ہے کہ وہ دوسروں کے تجربوں اور خوابوں کے غلام بن جائیں"۔ ۶ے سادہ الفاظ میں امریکہ (یا جاپان) ایک ترقی یافتہ ملک ہے' اگر آپ بھی ترقی کرنا چاہتے ہیں' تو آپ بھی وہی کیجیے' جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امریکیوں (جاپانیوں) نے کیا اور کر رہے ہیں۔

ایشیا اور افریقہ کے "ترقی پذیر" ممالک میں بالعموم اور مسلم معاشروں میں بالخصوص یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ ہم مغرب کی کورانہ تقلید نہیں کریں گے۔ ہم ان کی سائنس اور فنیات کو تو اختیار کر لیں گے، مگر ان کی سماجی اقدار، خاندانوں کی شکست و ریخت، مغائرت، نفسانفسی، چھین جھپٹ، حرص و ہوس، آزادروی، بے صبری اور مذہب بے زاری کو رد کر دیں گے۔

کیا ایسا ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب ہم دو جہتوں سے حاصل کر سکتے ہیں: سادہ طریق تو یہ ہے کہ ہم ان ملکوں کا جائزہ لیں، جنھوں نے بغیر کسی تکلف اور ہچکچاہٹ کے مغربی سائنس اور فنیات کو اختیار کر لیا۔ خوش قسمتی (!) سے ایسی مثالیں بہت واضح اور غیر مبہم طور پر دستیاب ہیں۔ ان میں سرفہرست جاپان ہے، پھر ہانگ کانگ، کوریا، تائیوان، سنگاپور، تھائی لینڈ، اور مشرق بعید کے بعض اور ممالک آتے ہیں۔ میجی انقلاب کے بعد جاپانیوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس اور فنیات میں کھلے دل کے ساتھ مغربی طرز کو اپنا لیا۔ آج جاپان اتنا ہی "ترقی یافتہ" ملک ہے، جتنا کہ کوئی مغربی ملک ہو سکتا ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جاپان ایک مغربی ملک ہی بن گیا ہے۔ جاپان کی صنعت و حرفت کو جس سائنس و فنیات نے فروغ دیا، اس کی دوسری جہت سرمایہ دارانہ نظام اور منڈی کی معیشت ہے۔ یہ نظام بڑے بڑے صنعتی خانوادوں اور اداروں کو جنم دیتا ہے، جن کے آگے چھوٹی صنعتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ پھر جاپان سمیت جہاں بھی یہ سائنسی، صنعتی اور تجارتی انقلاب نمودار ہوا، اس کا اپنا منطقی تقاضا یہ تھا کہ اس سے ہم آہنگ ایک سیاسی، سماجی اور اخلاقی کلچر بھی ظہور میں آئے، سو وہ ہو کر رہا۔ جاپان، تائیوان، ہانگ کانگ، اپنی ثقافت اور تہذیب کے اعتبار سے بڑی حد تک مغربی ممالک کی صف میں شامل ہو چکے ہیں۔ وہاں فی ہزار آبادی میں بچوں کی پیدائش، شادی اور طلاق، بے شادی خانہ آبادی، بچوں اور بچیوں کے ساتھ زیادتی، روحانی اور نفسیاتی عوارض، خودکشی، تشدد وغیرہ کے اعداد و شمار کا تقابلی مطالعہ بڑا چشم کشا ہو گا، کیوں کہ ان میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر اہل نظر کے نزدیک یہ مماثلت حیرت انگیز نہیں۔

خود مغربی عمرانیات کے مطابق انسان کا خارجی اور طبعی ماحول اور اس کے حالات کار، اس کے سماجی، اخلاقی رویے کی صورت گری کرتے ہیں۔ اب یہ بات کسی طرح بھی حیران کن نہیں ہونی چاہیے کہ بھارت، جو "سائنس اور صنعتی ترقی" میں پاکستان سے آگے ہے، اپنے نام نہاد مذہبی کٹرپن کے باوجود نفسانفسی، چھین جھپٹ، جنسی بے راہ روی، تشدد اور اخلاقی زوال میں بھی پاکستان سے آگے ہے، جب کہ برصغیر کے دونوں بڑے مذاہب (اسلام اور ہندومت) کے ماننے والوں کا، اپنے اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہب کے بارے میں رویہ مختلف نہ تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے مذاہب کا گہرا رنگ لیے ہوئے تھے' اور آخر کار یہی حقیقت بر صغیر کی تقسیم کا باعث بنی تھی۔ تاہم اب بھارت کا "ترقی پذیر" سائنسی 'صنعتی معاشرہ' وہاں کے باشندوں کے عمومی سماجی' اخلاقی کلچر پر واضح اثرات ڈال رہا ہے۔ "زی جنریشن"' اور بولی ووڈ (بروزن ہولی ووڈ) کلچر" جیسی اصطلاحات بھارت میں فروغ پانے والی نئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ہمارے نظریہ سازوں کو یہ بات بھی شعور میں رکھنی چاہیے کہ سائنس اور صنعت و معیشت کے ملاپ سے مغرب میں جو معاشرہ وجود میں آیا ہے' اس کا امتیازی نشان "تکاثر" ہے۔ نام نہاد ترقی یافتہ ملکوں میں ایک نچلے یا اوسط طبقے کے انسان کے لیے اپنی حقیقی ضروریات کی تکمیل کے لیے بہت زیادہ محنت اور تگ و دو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کاموں کی تحلیل اور تقسیم محنت نے' اس کے لیے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ چند گھنٹے ایک جگہ وہ مشینی انداز میں ایک مخصوص کام سرانجام دیتا رہے' جیسے اسمبلی لائن کا کارکن 'کلرک یا مخصوص امراض کا طبیب یا استاد۔ مگر صنعت و سرمایہ کے فروغ کا تقاضا یہ ہے کہ اسے قانع اکثریت کی بجائے' ہر دم جواں حرص میں گرفتار آبادی میسر ہو' جو اس کی نت نئی مصنوعات کے لیے تابع دار صارفین کا کردار ادا کرتی رہے۔ میڈیا' خصوصاً برقیاتی ذرائع ابلاغ نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے۔۵ چنانچہ جدید اشتہاری تکنیک اور بازار کاری کے نت نئے طریقوں سے عوام کو ایسی چیزوں کا خواہش مند اور پرستار بنا دیا گیا' جو کسی طرح بھی ان کی حقیقی ضروریات نہیں' مثلاً سگریٹ' مشروبات' قیمتی گھڑیاں' کاریں' غیر ضروری ملبوسات' مصنوعات آرائش و زیبائش' بقدر ہمت و ظرف ان کی خریداری کے لیے انھیں مزید محنت کی ضرورت ہو گی' اور جب ان کی یہ ضروریات پوری ہو جائیں گی' تو اسی طرح کی دوسری غیر ضروری "ضروریات" سامنے آ جائیں گی۹ غرض

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی   اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۱۰

کا منظر ہے۔ تحقیق و ترقی (R & D) اور صنعت و تجارت کے اس ناپاک گٹھ جوڑ نے "ترقی یافتہ" ممالک کے عوام کالانعام کو ایک ایسے چکر میں ڈال دیا ہے' جس سے نکلنا کم ہی لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ (جاری)

(انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام سیمینار (۷ جولائی 'کراچی) میں پڑھا گیا)

حواشی

1- Unabomber: Manifesto p .5

۲۔ اس تجزیے کے لیے دیکھیے' John Ralston Saul کی کتاب :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Voltair's Bastards: The Dictatorship of Reason in the West, p.170.

۳۔ مغرب کے غلبے میں زندگی گزارنے والی اقوام کے لیے یہ ناممکن ہو گیا ہے' کہ وہ ان کی زبان اور اصطلاحات سے آزاد ہو کر اپنے لیے کوئی نیا اسلوبِ اظہار فکر تلاش کر سکیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جن اصطلاحات کے سہارے ہم گفتگو کرتے ہیں' اور جو زبان ہم بولتے ہیں' بڑی حد تک وہی ہمارے اسلوب فکر کا تعین بھی کرتی ہے۔ Wolfgang Sachs کی The Development Dictionary پر ایک نظر ڈالنا مفید ہو گا۔

4- Wolfgang Sachs: The Development Dictionary, Zed Books London 1992, p 9.

5- Ibid, p 9.

6- Ibid, p 10.

۷۔ مختلف ممالک کے تقابلی مطالعے کے لیے دیکھیے: Paul Kennedy: Preparing for the Twenty-First Century, Hammersmith, London, 1994.

۸۔ ذرا تصور کیجیے کہ اہرام مصر کے خزانوں کے حصول کی پر خطر مگر کامیاب کوشش' پولو کے کھیل' کشتی رانی' سریع الحرکت کاروں کے مقابلے' گھڑ دوڑ میں جیت' حسین خواتین کے مرکز توجہ بننے کی مسرت میں کیا چیز مشترک ہے؟--- ایک برانڈ کا سگریٹ یا کوئی نرم مشروب۔

۹۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی اور "لا الہ سیاسی معیشت" کے نتیجے میں وجود میں آنے والی قومی سلطنت (میں اسے یہی کہوں گا)' ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔ مثالی' ان معنوں میں کہ ہمی ترقی پذیر ملک' کیا مسلم اور کیا غیر مسلم' اسی کی طرف اپنا قبلہ راست کرتے ہیں' اور اسے ایک نمونے کے طور پر پیش نظر رکھتے ہیں۔ امریکہ کی ترقی کا یہ حال ہے کہ ۱۹۷۳ سے وسط ۱۹۹۵ میں فی کس Real GDP میں ۳۸ فی صد اضافہ ہو گیا' لیکن عام محنت کش (non-supervisory worker) جو کسی کا افسر نہیں' کی فی ساعت اجرت میں ۱۴ فی صد کی ریکارڈ کمی ہوئی۔ ۸۰ء کے عشرے میں آمدنیوں کا سارا اضافہ' ۲۰ فی صد بالائی طبقے کے حصے میں آیا' اور قومی آمدنی کا ۶۴ فی صد (ایک خطیر مقدار) صرف بالائی ایک فی صد طبقہ لے اڑا۔ (دی اکانومسٹ لندن' ۹ مارچ' ۱۹۹۶)--- یہ اس ملک کا حال ہے' جہاں سائنس و فنیات کسی اسٹالن' ماؤزے تنگ یا صدام حسین کے ہاتھوں میں نہیں' بلکہ انھیں جمہور اد یا گیا ہے۔

۱۰۔ سونے یا پلاٹینم کے ٹھوس بلاک سے تراشیدہ' ہیرے جڑی ہوئی دست ساز ایک گھڑی کی قیمت چند لاکھ روپے سے زیادہ ہو سکتی ہے اور ایک کار' ایک کروڑ میں--- معمولی سی بات ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امریکی صیہونی حکمتِ عملی

ڈاکٹر خالد علوی

مسلمانوں کی تاریخ میں اسلامی احیا اور مسلمانوں کے غلبے کا جو تصور مقبول رہا ہے' وہ تجدید دین کی اصطلاح میں پوشیدہ ہے۔ سید مودودی نے اپنی کتاب تجدید و احیا دین میں اس حوالے سے ہونے والے کام کا ایک ایسا جائزہ پیش کیا ہے جسے اسلام کے حرکی تصور کا فہم رکھنے والا انسان نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اقبال نے بہت صحیح کہا ہے:

> ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام کے مطالعہ سے سیکھا ہے یہ ہے' کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا' نہ کہ مسلمان۔ مسلمان اگر آج اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرنو جمع ہو جائیں گی۔ اور آپ کا وجود ہلاکت اور بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ (خطبات اقبال' ص ۶۴)

ہر صدی کے سرے پر مجدد کی بعثت کی جو خبر حضور اکرمؐ کی طرف منسوب ہے وہ اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس میں تزکیہ کا ایک خود کار نظام موجود ہے جو ملت اسلامیہ کے اجتماعی شعور کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اسلام کی بقا' ختم نبوت کی حفاظت اور اسلام کے فکری غلبے کی بنیادی علامت یہ ہے کہ ان امتی لاتجتمع علی ضلالۃ یعنی امت مسلمہ کا اجتماعی شعور کبھی کسی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو گا۔ بلاشبہ مسلمان معاشروں میں الحادی تحریکوں' انحرافی گروہوں' گمراہیوں اور بدعات کا فروغ بھی ہو سکتا ہے' لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ امت مسلمہ کسی گمراہی' بدعت اور الحادی فکر پر مجتمع ہو جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم تاریخ میں کبھی ایک فرد اٹھتا ہے اور وقت کے اندھیروں اور زمانے کی تاریکیوں کے خلاف مصروف جہاد ہوتا ہے' اور اسلام کے نور کو چہار سو پھیلا دیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعی قیادتیں یہ کام کرتی ہیں' اور دیکھتے ہی دیکھتے نور کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں اور اندھیرے پسپائی اختیار کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں امریکی سازشوں اور امریکی عزائم کی بات اتنی عام ہے کہ یہاں پر ہونے والی معمولی سی بات میں بھی امریکی صیہونی سازش نظر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بات ایک مذاق سی بن گئی ہے۔ اس

© rasailojaraid.com